ڈاکٹر جواز جعفری

چیئرمین شعبہ ءاردو ایم۔اے۔او کالج، لاہور

برصغیر میں موسیقی کی بیٹھکوں کی روایت

Dr. Jawaz Jafri
Head of Department , Urdu
M.A.O College Lahore

Tradition of Music Festivals in the Subcontinent

This Article covers certain classical music 'Baitaks' and their immortal affect over classical music traditions all over subcontinent peninsule. These Baitaks have over the years been inspiring the evolution and innovation of classical music. Various known and unknown places and areas, cities and towns formed these Baitaks representing cultural awareness and civilization consciousness through their gharana Gayeks, and also became the mode of conversational determination towards classical musics. In these Baitaks, were held grand Gaykee competetions, and music Music Gurus and Pandits nourished students. Now these Baitaks are losing their thread and their being is at state-Governments should patronize to save these tradtional Centres of Culture and Music and come forward to prevent otherwise the indispensable impending extinction.

بیٹھک ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی نشست گاہ یا بیٹھنے کے طریقے کے ہیں۔ قدیم کلچر میں بیٹھک رہائش گاہ کا ایک ایسا کمرہ ہوتا تھا جہاں بیٹھ کر خواتین و حضرات (بالخصوص مرد) آپس میں تبادلہء خیالات کیا کرتے تھے۔ اگرچہ بیٹھک (ڈرائنگ روم) کا تصور اب بھی ہمارے گھروں میں پایا جاتا ہے لیکن اس سے وابستہ تہذیبی اقدار آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جارہی ہیں۔ ہندوستان میں بادشاہ اپنے ایوان (محل) یا دیوان (دربارِ شاہی۔ نشست گاہ) میں بیٹھ کر ملک کے ممتاز عالموں، شاعروں، دانشوروں، موسیقاروں، قانون دانوں اور فنکاروں کے ساتھ مجلس آرائی کیا کرتا تھا۔ اس لیے بادشاہ ہی کی نقل کرتے ہوئے امراء نے دیوان خانے اور درمیانے طبقے کے سفید پوش لوگوں نے بیٹھکیں بنالیں۔ یہ

بیٹھکیں ہماری تہذیبی زندگی کا نشان تھیں ان بیٹھکوں میں بیٹھنے والے ہر طرح کے موضوعات پر تبادلہء خیالات کیا کرتے تھے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی یہ بیٹھکیں ایک طرح سے نئے خیالات و افکار اور نئے نئے علوم و فنون کی نشر گاہیں تھیں۔ دلّی ہو یا کلکتہ، آگرہ ہو یا حیدر آباد، امر تسر ہو یا لاہور، بیٹھک کلچر ہر جگہ مقبول تھا۔ بیٹھک کلچر کے حوالے سے دلچسپ امر یہ ہے کہ یہ بیٹھکیں کسی ایک طبقے کے ساتھ مخصوص نہ تھیں بلکہ پہلوانوں، شاعروں، دانشوروں، عالموں، گوّیوں، ادیبوں اور ڈیرے دار طوائفوں کی اپنی اپنی بیٹھکیں ہوا کرتی تھیں۔ یوں تو سارا سارا دن بیٹھکیں علم و فن سے تعلق رکھنے والے احباب کے وجود سے چھلکتی رہتیں لیکن شام ہوتے ہی ان بیٹھکوں کی رونقیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں تک ہر شخص کی ایک ذہنی زندگی بھی ہوا کرتی تھی اور لوگ اپنی ذہنی زندگی کا بڑا احترام کیا کرتے تھے۔ شام ہوتے ہی پڑھے لکھے افراد ہوٹلوں اور بیٹھکوں کا رُخ کرتے جہاں چائے نوشی کے دوران دنیا بھر کے علمی، ادبی اور سیاسی موضوعات پر گفتگو چلا کرتی۔ لاہور اس حوالے سے ایک ایسا تہذیبی شہر ہے جہاں فرد کی ذہنی زندگی کو جِلا بخشنے کے لیے عرب ہوٹل، لارڈز ہوٹل، پاک ٹی ہائوس، کافی ہائوس، نگینہ بیکری، شیزان ہوٹل اور اورینٹ ہوٹل سمیت بہت سے دوسرے ریستوران موجود تھے جہاں انڈو پاک کے نامور اہل قلم ہر روز جمع ہوتے اور ان کے درمیان پروان چڑھنے والے خیالات اور مباحث دیکھتے ہی دیکھتے پورے برصغیر میں پھیل جاتے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مختلف علوم و فنون کے درمیان ابھی دیواریں نہ اُٹھائی گئی تھیں اور شاعروں سے لے کر موسیقاروں تک اور علماء سے لے کر پہلوانوں تک سبھی ایک ہی بیٹھک میں جمع ہوتے تھے۔ گویا ہر شعبے کا آدمی اپنی تہذیب و ثقافت کو ثروت مند بنانے کے لیے بے قرار تھا۔ ایک طرف یہ بیٹھکیں نئے آنے والوں کے لیے تربیت گاہ کا کام دیتیں تو دوسری طرف یہی بیٹھکیں پڑھے لکھے افراد کی ذہنی زندگی کے لیے تفریح گاہیں اور نئے نئے خیالات کے لیے نشر گاہوں کا کردار ادا کر رہی تھیں۔ یوں تو ہر بڑے شہر میں ہر قسم کے علوم و فنون کی بیٹھکیں موجود تھیں مگر ادب اور موسیقی سے متعلق بیٹھکیں ہر شہر میں خصوصی امتیاز و اختصاص رکھتی تھیں۔ پچھلی دو صدیوں کی دہلی اور لاہور کی سماجی و علمی زندگی پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں مرزا غالب، صدر الدین آزردہ، ابراہیم ذوق، سر سیّد احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، سجاد

ظہیر، کیفی اعظمی، مجاز، جذبی، عابد علی عابد، عبدالرحمن چغتائی، صادقین، صوفی تبسم، پطرس بخاری، احسان دانش، حفیظ جالندھری، سر عبدالقادر، محمد طفیل نقوش، فیض احمد فیض، استاد دامن اور علامہ اقبال سمیت بڑے بڑے اہل قلم کی بیٹھکیں نظر آتی ہیں۔ لاہور کے بھاٹی دروازے کے محلہ جلوٹیاں (بازار حکیماں) میں وہ مکان آج بھی موجود ہے جہاں علامہ اقبال کی بیٹھک ہوا کرتی تھی۔ ہر شام اس زمانے کے نامور اہل قلم، علماء اور اہلِ سیاست یہاں جمع ہو کر ہندوستانی زندگی کے مختلف پہلوئوں پر تبادلہء خیالات کیا کرتے تھے۔ یہاں آنے والوں میں مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، مولانا محمد حسن جالندھری، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین، سر محمد شاہ دین، سر محمد شفیع، فقیر سیّد افتخارالدین، خلیفہ حمید الدین، حاجی شمس الدین اور مولوی حاکم علی (جنہوں نے انجمنِ حمایت اسلام کی بنیاد رکھی) جیسی نابغہء روزگار ہستیاں شامل تھیں۔ مولانا ظفر علی خان نے بھی حیدر آباد دکن سے واپسی کے بعد اسی کوچے (کوچہء سبز پیر) میں قیام کیا۔ مولانا حامد علی خاں اور پروفیسر حمید احمد خاں بھی یہیں قیام پذیر رہے۔ آغا حشر کاشمیری کی بیٹھک بھی بھاٹی دروازہ کے اندر ہوا کرتی تھی یہاں عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت اور امتیاز علی تاج اکثر آیا کرتے تھے۔ اُدھر حضوری باغ کے قریب استاد دامن کی کوٹھڑی تھی (ایک روایت کے مطابق جہاں شاہ حسین نے قیام کیا تھا) جہاں فیض، احمد راہی، زیڈ اے بخاری، ایم ڈی تاثیر، اے حمید اور صوفی تبسم جیسے لوگوں کا جھمگٹا لگا رہتا تھا۔

پاک وہند میں ادیبوں اور شاعروں کی بیٹھکوں کے متوازی کلاسیکل گانے والوں کی بیٹھکوں کی ایک پوری کہکشاں آباد تھی۔ ان بیٹھکوں سے استاد علی بخش خاں جرنیل، فتح علی خاں کرنیل، بڑے غلام علی خاں، برکت علی خاں، عاشق علی خاں، توکل حسین خاں، امیر خاں، سلامت علی خاں، نزاکت علی خاں، پیارے خاں، امانت علی خاں، فتح علی خاں، عبدالکریم خاں، رجب علی خاں، فیاض خاں، عبدالوحید خاں، روشن آراء بیگم، مگوبائی، کشوری امونکر، ہیرابائی بروڈکر، کیسر بائی، بھائی لعل خاں اور استاد اللہ دِیا خاں جیسے استادانِ فن وابستہ تھے۔ موسیقی اس زمانے کی روحِ عصر کا حصہ تھی۔ موسیقی کی ان بیٹھکوں کے علاوہ ہر شہر میں تکیے ہوا کرتے تھے جہاں فن کاروں کے درمیان گانے کے میدان لگا کرتے تھے۔ ایسے مقابلوں سے پہلے موسیقی کے حلقوں میں الائچی پھیری جاتی اور شہر کی خلقت ان تکیوں میں اُمڈ آتی اور

یوں ان تکیوں میں اُس عہد کے بڑے بڑے گوّیوں کے درمیان میدان سجتے۔ ان تکیوں کے آس پاس بسنے والے کن رَس لوگ، لوگوں سے چندہ اکٹھا کر کے لنگر پکاتے اور یوں کئی کئی روز تک لوگ موسیقی سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ ان تکیوں اور بیٹھکوں میں گویّے آتے جاتے رہتے تھے۔ لوگ بھی نہایت صاحبِ ذوق تھے اگر گویّا پسند آجاتا تو اس کے صدقے واری جاتے اور اگر معاملہ ذوق کے برعکس ہوتا تو لوگ گانے والے کے منہ پر ہی اپنے جذبات کا اظہار کر دیتے۔ بعض پرانے سننے والوں کی روایتوں کے مطابق گانے کے ایک ایسے ہی مقابلے کے پس منظر میں بڑے غلام علی خاں، عاشق علی خاں کے اور استاد بھائی لعل، بھاسکر رائو کے گنڈہ بند شاگرد ہوئے۔ موسیقی کی یہ بیٹھکیں ایک عرصے تک موسیقی کی تخلیق و ترویج کے مراکز کا کردار ادا کرتی رہیں۔ یہیں استادانِ فن نئی دُھنیں ایجاد کرتے، نئے راگ تصنیف ہوتے، خود ریاض کرتے اور شاگردوں کی تربیت کا فریضہ انجام دیتے، دوست احباب سے ملتے ملاتے اور یہیں موسیقی کے رموز پر تبادلہء خیالات کیا کرتے۔ گویا یہ بیٹھکیں ''امرائو جان ادا'' کا کوٹھا تھیں جہاں ہر طبقے کے لوگ کھنچے چلے آتے۔ شاعر، ادیب، پہلوان، بیوروکریٹ، موسیقار، گلوکار، اداکار، پروموٹر، ڈائریکٹر، پروڈیوسر اور موسیقی کے شوقین سبھی ان بیٹھکوں کی طرف کشش محسوس کرتے تھے۔ یہ بیٹھکیں محض بیٹھنے کی جگہیں نہ تھیں بلکہ گزشتہ صدیوں کے لوگوں کی فکری و ذہنی زندگی کے اشارے تھے۔ یہاں کسی کے لیے ممانعت نہ تھی بلکہ ہر کوئی یہاں بے دھڑک آسکتا تھا، سن سکتا تھا اور سیکھ سکتا تھا گویا لوگوں کے پاس وقت بھی تھا اور موسیقی کا ذوق بھی۔ ویسے بھی یہ زمانہ موسیقی کے لیے اپنے اندر احترام اور اپیل رکھتا تھا، تفریح کے ذرائع محدود تھے، بڑے بڑے علماء موسیقی سنتے اور اس حوالے سے علمی مباحث میں شریک ہوتے تھے، ابھی موسیقی کے حوالے سے حلال اور حرام کے مباحث نے سر نہیں اُٹھایا تھا۔ ملک کے کونے کونے سے آنے والے فنکار دلّی، کلکتہ، بمبئی، حیدر آباد، کراچی، امر تسر، لاہور، بھوپال، اندور، رام پور، جے پور اور آگرہ کی ان بیٹھکوں کا رُخ کرتے، کئی کئی روز قیام کرتے، گانا سنتے اور سناتے اور کبھی کبھار ان بیٹھکوں میں موسیقی کے مباحث کے حوالے سے بڑے بڑے مبادلے، مجادلے، مقابلے اور محاربے بھی جنم لیتے تھے مگر یہ ساری سرگرمیاں موسیقی کے فروغ کا حصہ تھیں۔

یہ سوال اس حوالے سے خاصا اہم ہے کہ موسیقی کی یہ بیٹھکیں (عام طور پر) برصغیر کے ہر بڑے شہر میں بازارِ حسن کے اندر یا ان کے قریبی علاقوں ہی میں کیوں وجود میں آئیں؟ اگرچہ تمام بیٹھکوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں تھا البتہ دونوں طرح کی بیٹھکوں کا بازارِ حسن سے گہرا تعلق ضرور رہا ہے۔ اس زمانے کی بہت سی گانے والیاں بازارِ حسن سے تعلق تو رکھتی تھیں مگر یہ جسم فروش عورتیں نہ تھیں بلکہ یہ عورتیں اوّل و آخر فن کار تھیں۔ اس کے علاوہ بے شمار رقاص عورتیں بھی فن کارائیں ہی تھیں اور اُن کا بھی جسم فروشی کے دھندے سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ بازارِ حسن کی عورتیں گانے والی ہوں یا رقص کرنے والی دونوں قسم کی عورتوں کو سازندوں کی ضرورت پیش آتی تھی جو بعض اوقات گانے کی انہی بیٹھکوں سے وابستہ ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں فن سے وابستہ یہ عورتیں فنِ موسیقی کو سیکھنے کے لیے انہی استادانِ فن کی طرف دیکھتی تھیں اور یہ حضرات بھی زمینی قربت کی وجہ سے انہیں آسانی سے دستیاب ہو جاتے تھے۔ موسیقی سے وابستہ فنکاروں کا بازارِ حسن کے قریب بیٹھکیں حاصل کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ یہ علاقے اپنی مسلمہ ثقافتی اہمیت بھی رکھتے تھے۔ اس لیے بڑے بڑے پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور پروموٹر ٹیلنٹ کی تلاش اور فن کاروں کی بکنگ کے لیے انہی علاقوں کا رُخ کرتے تھے۔ ایک طرف یہ بیٹھکیں دربار کا متبادل (موسیقی کے فروغ کے حوالے سے) تھیں تو دوسری طرف نئے مال کی فروخت کے لیے مارکیٹنگ کا ذریعہ بھی تھیں۔ آج کے بڑے بڑے گائیک اسی بیٹھک کلچر ہی کی بدولت سامنے آئے۔ یہ بیٹھکیں اس اعتبار سے دربار کا تسلسل تھیں کہ جب ہندوستان میں مرکزی حکومت کمزور ہوئی تو بے شمار راجوں، مہاراجوں اور نوابوں نے اپنی ریاستیں قائم کر لیں اور مرکزی دربار کی طرز پر اپنے درباروں سے فنکاروں کو وابستہ کر لیا اور یوں ان حکمرانوں نے ایک دوسرے سے بڑھ کر فن کی قدردانی کی مگر آزادی کے بعد جب ریاستیں اپنا وجود کھو بیٹھیں تو فن کار ایک طرح سے لاوارث ہو گئے اور انہوں نے اپنے فن کی پیشکش کے لیے بیٹھکوں کے کلچر کو فروغ دیا۔ ایسی سینکڑوں بیٹھکیں (آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد) دونوں ملکوں میں موسیقی کے فروغ کے لیے اپنا تاریخی کردار ادا کر رہی تھیں۔ یہاں ہم ان میں سے موسیقی کی چند بیٹھکوں کا ذکر کریں گے۔

استاد بڑے غلام علی خان کی بیٹھک: (1903ئ-1968ئ)

یہ بیٹھک بازارِ حسن (لاہور) میں واقع نوگزے کی قبر کے قریب تھی۔ اس مزار کے سامنے استاد بڑے غلام علی خان کا مکان تھا۔ اس مکان کے صدر دروازے کے بائیں جانب ایک برتن فروش (کمہار) کی دکان تھی۔ اس دکان کے ساتھ ہی ایک تنگ و تاریک زینہ اوپر کی طرف جاتا تھا، آٹھ سات زینے طے کرنے کے بعد دائیں جانب اس بیٹھک کا دروازہ کھلتا جبکہ بائیں طرف والی بیٹھک ان کے بھائی استاد مبارک علی خاں کی تھی۔ بڑے غلام علی خاں کی عمر کا بیشتر حصہ اگرچہ لاہور میں گزرا لیکن ان کی جنم بھومی قصور تھی اور وہ قصور گھرانے کے نامور گائیک استاد علی بخش خاں کے بیٹے تھے۔ علی بخش نے موسیقی کی ابتدائی تعلیم اپنے ماموں پیر بخش سے حاصل کی تھی جو دہلی گھرانے کے استاد تان رس خان کے شاگرد تھے۔ بعد ازاں علی بخش خاں اور ان کے بھائی کالو خان پٹیالہ گھرانے کے استاد علی بخش جرنیل اور استاد فتح علی خاں کرنیل کے شاگرد ہوئے۔ غلام علی خاں کے والد نے سات سال کی عمر میں انہیں کلّن خاں پٹیالوی کے سامنے زانوئے تلمذّ طے کرایا اور دس سال تک سیکھنے کے بعد انہوں نے اپنے والد (علی بخش خاں) اور چچا (کالو خاں) سے تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ بعد ازاں خاں صاحب نے کیرانہ گھرانے کے ممتاز گائیک استاد عبدالوحید خاں سے بھی استفادہ کیا۔

موسیقی کے علاوہ اس بیٹھک کی وجہء شہرت یہ تھی کہ یہاں آنے والے ہر شخص کو کھانا، چائے، سگریٹ اور پان بھی ملتا تھا۔ استاد بڑے غلام علی خان بڑے کھلے دل کے مالک تھے اور میزبانی ان کی بیٹھک کا طرۂ امتیاز تھی۔ اگرچہ یہ بیٹھک وقت کے ساتھ ساتھ لاہور سے کراچی، بمبئی اور کلکتہ منتقل ہوتی رہی مگر خان صاحب نے تنگی اور خوشحالی کے زمانوں میں بھی ہمیشہ اپنی مہمان نوازی کی روایت کی پاسداری کی۔ وہ اپنی آمدنی میں سے غرباء کی مدد کرتے، لوگوں کو ملازمتیں دلواتے، یتیم بچیوں کی شادیاں کراتے، ان کے گھر اور بیٹھک میں ہر وقت لوگوں کا جھمگٹا لگا رہتا اور یوں یہ بیٹھک کسی روحانی پیشوا کا آستانہ لگتی تھی۔ ان کی بیٹھک چاہنے والوں اور شاگردوں سے چھلکتی رہتی مگر انہوں نے اس منظر نامے سے کبھی فرار کی کوشش نہیں کی۔ وہ گود میں سُر منڈل رکھے ہمیشہ ریاض میں غرق نظر آتے۔ اس بیٹھک میں اس عہد کے نامور گوّیے اور سازندے استاد عاشق علی خاں، زاہدہ پروین، توکل حسین خاں، استاد سلامت علی خاں، استاد نزاکت علی خاں، استاد سردار خاں، استاد مانڈو خاں، میاں شوکت حسین

خاں، استاد عبدالوحید خاں اور استاد امید علی خاں جلوہ گر ہوا کرتے اور یہاں گانے کے علاوہ موسیقی کے اسرار و رموز پر دل کُشا بحثیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ عام طور پر کلاسیکل گائیک شاگردوں کو سکھانے کے حوالے سے کنجوسی کے مرتکب پائے جاتے ہیں مگر خاں صاحب اس حوالے سے خاصے دریا دل واقع ہوئے تھے۔ ان کے مستقل سازندوں میں عنایتی لمبا (طبلہ نواز) اور امیر بخش عرف بیرے خان (ہارمونیم نواز) تھے جو خان صاحب کے ساتھ اسی بیٹھک میں رہتے تھے۔ زیڈ اے بخاری سے اختلاف کے بعد خان صاحب ہندوستان چلے گئے مگر ان کی بیٹھک وہاں بھی موسیقی کے شائقین کے لیے مرکزِ نگاہ بنی رہی۔

استاد بھائی لعل کی بیٹھک:(1887ئ-1962ئ(

سنگیت ساگر کے لقب سے شہرت پانے والے استاد بھائی لعل کا تعلق مشرقی پنجاب کے مشہور شہر امرتسر سے تھا جو سیاسی، فکری اور مذہبی حوالوں سے خصوصی شہرت رکھتا ہے۔ آپ 1887ء میں میاں عطا محمد کے ہاں پیدا ہوئے۔ موسیقی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کرنے کے بعد 1919ء میں میاں محبوب علی خاں کے اور 1921ء میں ہندوستان کے نامور استاد، بھاسکر رائو کے شاگرد ہوئے جس کے نتیجے میں انہیں ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی۔ جہاں تک ان کے نام کے ساتھ لفظ ''بھائی'' کے استعمال کا تعلق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سکھ عہد میں سکھوں کے گردواروں میں کیرتن کے لیے نہ صرف گوّیے موجود تھے بلکہ گرو گرنتھ صاحب کے پارٹ پڑھنے کے لیے گرنتھی بھی مامور ہوتے تھے جو ان کی کتابِ مقدس کے مختلف حصوں کو راگوں میں گا کر پیش کرتے تھے۔ ادھر گورونانک جی کے دو خاص چیلے بھائی بالا اور بھائی مردانہ تھے جو اپنے گانے سے ان کا دل بہلاتے تھے چنانچہ بعد ازاں گرودواروں میں کیرتن کرنے والے گوّیوں کے ناموں کے ساتھ بھی ''بھائی'' کا لفظ لگایا جانے لگا۔ آج کل جن گانے والوں کے ناموں کے ساتھ بھائی کا لفظ استعمال ہوتا ہے یہ گردواروں میں کیرتن کرنے والے انہی گوّیوں کی اولادیں ہیں۔ 1

امرتسر میں بھائی لعل کی رہائش پاسیا والد چوک میں جبکہ موسیقی کی بیٹھک ہال بازار میں واقع تھی جسے شہر میں موسیقی کی ایک شاندار درس گاہ کی حیثیت حاصل تھی۔ اس بیٹھک میں ہندوستان بھر سے نامور

گوّیے جمع ہوتے اور موسیقی کی یادگار محفلیں برپا ہوتیں۔ امرتسر شہر ویسے بھی اپنے شاعروں، پہلوانوں اور گوّیوں کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں کے لوگ گوالیار کے لوگوں کی طرح موسیقی سے خاص شغف رکھتے تھے۔ شہر کے بڑے بڑے رئیس اور نواب گانا سننے اس محفل میں آیا کرتے تھے۔ امرتسر کے گھر گھر میں موسیقی کے چرچے تھے اور یہی وہ ماحول تھا جس نے فریدہ خانم اور مختار بیگم جیسی گلوکارائیں اور نتھو خان اور عالمگیر خان جیسے نامور سازندے پیدا کیے۔ بھائی لعل کی بیٹھک نہ صرف موسیقی کے چاہنے والوں کے لیے تسکین کا ذریعہ تھی بلکہ اس بیٹھک کی کلاسیکی موسیقی کی دین یہ ہے کہ جہانگیر خان (بینڈ ماسٹر) عالمگیر خان (کلاونت) سنتو خاں، صوفی خدا بخش، قادر فریدی، سائیں اختر اور اوم پرکاش جیسے فنکاروں کی تربیت اور تراش خراش میں اسی بیٹھک نے بنیادی کردار ادا کیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد بھائی لعل کی بیٹھک لاہور منتقل ہوگئی۔ یہاں آکر بھی اس بیٹھک میں گُنی اور کسبی لوگوں کا جھمگٹا لگا رہتا تھا۔ یہ بیٹھک ہیرا منڈی کے نواح میں واقع تھی۔ اسی بیٹھک میں بھائی لعل نہ صرف خود ریاض کرتے بلکہ اپنے ہونہار بیٹے غلام حسین خان شگن سمیت شاگردوں کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔2

استاد برکت علی خاں کی بیٹھک:(پیدائش 1910ئ(

یہ بیٹھک بازارِ حُسن (لاہور) میں نوگزے کی قبر کے سامنے واقع تھی۔ اس بیٹھک نے کم از کم تین نسلوں کی غنائی تربیت میں حصہ لیا۔ تنگ و تاریک سیڑھیاں سیدھی جا کر اسی بیٹھک میں کھلی تھیں۔ بقول اے حمید اس بیٹھک کا دروازہ تو تھا مگر زنجیر اور تالے سے بے نیاز تھی۔ آنے والا ابھی آدھی سیڑھیاں ہی طے کر پاتا تھا کہ ہارمونیم اور طبلے کے ہمراہ استاد برکت علی خاں کی آواز سنائی دینے لگتی تھی۔ استاد برکت علی خاں اپنے عہد کے ممتاز گائیک اور ٹھمری انگ میں گائی جانے والی غزل کے بانی تھے۔ آنے والے دنوں میں مختار بیگم، بیگم اختر، علی بخش قصوری اور علی بخش ظہور نے انہی کے رنگ کو آگے بڑھایا۔ برکت علی خاں شروع میں خیال گائیکی سے وابستہ تھے مگر بعد ازاں انہوں نے خود کو ٹھمری، دادرا، کافی اور غزل تک محدود کر لیا۔ اپنے زمانے کی سبھی اہم کانفرنسوں میں مدعو کیے جاتے تھے۔ انہوں نے عمر بھر سُر کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کی۔ 1940ء کی دہائی میں برکت علی خاں کی بیٹھک کا شمار شہر کی

اہم ترین بیٹھکوں میں ہوتا تھا۔ ہندوستان کے طول و عرض سے جو بھی گوّیا لاہور وارد ہوتا وہ اس بیٹھک میں ضرور حاضر ہوتا۔ آئے دن اس بیٹھک میں بڑے بڑے فنکار گانے کے لیے آتے اور یوں لوگوں کو مفت میں بڑی بڑی آوازوں سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ مل جاتا۔ یہاں گانا سننے کے لیے کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔ اپنے کاموں کے لیے نکلے ہوئے لوگ اچانک آواز سن کر ٹھہر جاتے اور ضروری کاموں کو بُھلا کر اس بیٹھک کی سیڑھیاں چڑھنے لگتے اور پھر گھنٹوں کے حساب سے اپنے عہد کی سُریلی آوازوں سے لطف اندوز ہوتے۔ اسی زمانے میں برصغیر کے عظیم گلوکار محمد رفیع بھی برکت علی خاں سے سیکھنے آتے تھے۔ انہی دنوں نامور غزل گائیک غلام علی بھی اُن سے بطور شاگرد تربیت حاصل کر رہے تھے اور بعض سننے والوں نے اسی زمانے میں ان کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کر دی تھی۔

اسی بیٹھک سے اس عہد کے ایک اور نامور گائیک استاد مبارک علی خان بھی وابستہ تھے۔ یہ باپ (استاد علی بخش خاں قصوری) کی طرف سے بڑے غلام علی خاں اور برکت علی خاں کے سگے بھائی تھے۔ جبکہ ان کی والدہ استاد قادر بخش پکھاوجی کی بیوہ ماں تھیں جس سے استاد علی بخش قصوری نے دوسری شادی کر لی تھی اور اسی سے استاد مبارک علی خاں اور ان کے بھائی امانت علی خاں پیدا ہوئے۔ استاد مبارک علی خان نہایت خوبصورت اور خوش پوشاک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کلکتے میں بننے والی فلم "سوہنی مہینوال" میں بطور ہیرو کاسٹ کیے گئے۔3 اس کے علاوہ خان صاحب فلموں کے میوزک ڈائریکٹر بھی تھے اور ان کی مقبول فلم "دو آنسو" پاکستان کی پہلی گولڈن جوبلی فلم قرار پائی لیکن بعد ازاں پے در پے فلمیں فلاپ ہونے سے ان کا فلمی موسیقی والا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔

خوبصورت اور اپنے عہد کے نامور کلاسیکل گائیک ہونے کے ساتھ ساتھ مبارک علی خان بہت خوش مزاج اور ملنسار بھی تھے اور ادب اور ادیبوں سے بھی ان کے خصوصی روابط تھے۔ اُس عہد کے بڑے بڑے اہل قلم احمد راہی، اے حمید، سلیم شاہد، منٹو، انور جمال شمزا (مصور) سمیت بہت سے ادیب اور شاعر ان کی بیٹھک میں اکثر آیا کرتے تھے۔ یہاں شعر خوانی اور موسیقی کے ساتھ ساتھ فقرے بازی کی محفلیں بھی جمتی تھیں۔ ایک روز اے حمید، احمد راہی، سلیم شاہد، انور جمال شمزا اور چند دوسرے ادیب استاد مبارک علی خاں سے ملنے گئے تو انہوں نے اپنی دلنواز مسکراہٹ کے علاوہ پان، سگریٹ اور چائے

سے مہمانوں کی تواضع کی۔ اس شام آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تیر رہے تھے۔ سلیم شاہد مرحوم نے موسم کو دیکھتے ہوئے کہا "آج تو ہم آپ سے راگ ملہار کی استھائی ضرور سنیں گے تاکہ بارش برس پڑے" ان کی بات سن کر استاد مبارک علی خاں نے زور کا قہقہہ لگایا اور بولے "جن کے ملہار گانے سے بارش ہوتی تھی وہ بہت جَتی ستی اور عبادت گزار لوگ ہوا کرتے تھے۔ ہم ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ میرے ملہار گانے سے کہیں دھوپ ہی نہ نکل آئے۔"

اُس زمانے میں یہ روایت ہوا کرتی تھی کہ حلقہء اربابِ ذوق کے زیر اہتمام یومِ میراجی کے موقعہ پر میرا جی کا پسندیدہ راگ جے جے ونتی ضرور سنا جاتا تھا۔ ایک روز شہرت بخاری گھبرائے ہوئے پاک ٹی ہائوس میں داخل ہوئے اور اے حمید اور سلیم شاہد سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے "آج شام یومِ میراجی ہے۔ استاد امانت علی خاں نے جے جے ونتی گانے کا وعدہ کیا تھا مگر انہیں اچانک کہیں جانا پڑ گیا ہے، سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے کہ کس فنکار کو بُلایا جائے۔" پھر اے حمید سے کہنے لگے "استاد مبارک علی خاں سے تمہاری دوستی ہے، پانچ منٹ ہی گا دیں تو عزت رہ جائے گی" چنانچہ سارے دوست اسی وقت مبارک علی خاں کی بیٹھک میں پہنچے اور ان سے گانے کی درخواست کی جو انہوں نے فوراً قبول کر لی۔ شام کو خان صاحب نہ صرف وقت پر آئے بلکہ دیر تک اہل قلم کو اپنی آواز سے محظوظ بھی کرتے رہے۔3

استاد امیر خان کی بیٹھک: (پیدائش 1912ئ)

اِندور میں واقع اس بیٹھک کا شہرہ دور دور تک تھا۔ کوئی سنگیت کار اِندور آتا یا اس کے گردونواح سے گزرتا تو وہ اس بیٹھک میں حاضری دینا اپنا فرض منصبی سمجھتا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی گائیک اندور آئے اور امیر خاں کے خاندان کے لوگ اس کا گانا سُنے بغیر اسے واپس جانے دیں چنانچہ اس بیٹھک میں آئے دن موسیقی کی محفلیں سجا کرتیں جن میں ہندوستان کے نامور گائیک اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے۔ امیر خاں کے بزرگ مغل دربار کے سنگیت کاروں میں شمار ہوتے تھے۔ یہ خاندان سارنگی نوازی کے حوالے سے ملک گیر شہرت کا حامل تھا مگر اپنی تمام تر ناموری کے باوجود اِندور ابھی گھرانے کے درجے پر فائز نہیں ہوا تھا بلکہ اس خاندان کے فن کار بھنڈی بازار گھرانے ہی سے وابستہ تھے۔ یہ اعزاز استاد امیر خان کو حاصل ہوا کہ انہوں نے اپنی منفرد گائیکی کی بنیاد پر اندور کو گھرانے کے درجے پر فائز کر دیا۔

امیر خاں کے والد شمشیر خان بھنڈی بازار گھرانے کے گلوکاروں کے ساتھ سارنگی نوازی کیا کرتے تھے۔ سارنگی اس گھرانے کا خصوصی ساز ہونے کے پس منظر میں امیر خاں کی تعلیم کا آغاز بھی سارنگی بجانے سے ہوا۔ مگر کچھ ہی عرصے کے بعد امیر خاں نے سارنگی بجانے سے انکار کر دیا اس سارے عرصے کے دوران اُن کی توجہ مسلسل گانے کی طرف منتقل ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ آواز میں ان کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے ان کے والد نے نئے سرے سے ان کی تعلیم کا بندوبست کیا اور یوں امیر خاں گائیکی کے سفر پر روانہ ہوئے۔ جلد ہی اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنیاد پر انہوں نے بڑے بڑے فن کاروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ مسلسل ریاض، انہاک اور پرانی روایتوں کی چھان پھٹک سے ایک ایسا اسلوب ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کے نتیجے میں اندور گھرانے کی گائیکی نے جنم لیا۔ کلاسیکی موسیقی کی تاریخ میں امیر خاں وہ فن کار ہیں جن کی گائیکی کے رنگ ان کے معاصر اور بعد میں آنے والے بڑے بڑے موسیقاروں کے اسلوب میں صاف دیکھے جاسکتے ہیں لیکن خود امیر خاں کی گائیکی پر استاد عبدالوحید خاں کیرانوی کا گہرا اثر تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ ان کی گائیکی کا سارا حسن استاد عبدالوحید خاں (المعروف بہرے خاں) کے اسلوب کا مرہونِ منّت ہے۔ اس سلسلے میں بہرے خاں صاحب بھی ان کے انتہائی معترف تھے ان کا کہنا تھا کہ ان کا فن ان کے مرنے کے بعد کافی عرصے تک امیر خاں کی شکل میں زندہ رہے گا۔

استاد امیر خاں کی بیٹھک اِندور، دہلی، بمبئی اور کلکتہ کے درمیان مسلسل ہجرت کے عمل سے گزرتی رہی مگر ہر جگہ یہ بیٹھک اہلِ فن کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ گُنی اور کسبی لوگ ہر جگہ اس بیٹھک کا رُخ کرتے رہے۔ استاد امیر خاں اِندور سے دہلی منتقل ہوئے یہاں بھی ان کی بیٹھک موسیقی کے فن سے وابستہ افراد کے لیے درس گاہ کی حیثیت اختیار کیے رہی مگر والد (شمشیر خاں) کی وفات کے بعد انہیں دوبارہ اِندور منتقل ہونا پڑا۔ گھریلو حالات میں کچھ استحکام پیدا ہوا تو استاد امیر خاں بمبئی چلے آئے۔ یہاں نہ صرف انہوں نے بڑی بڑی کانفرنسوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا بلکہ بعض بڑے بینرز کی فلموں میں انہیں کلاسیکل گانے کی پیشکش بھی ہوئی۔ ان فلموں میں فن کے مظاہرے نے ان کے فن کو خاص حلقے سے نکال کر عوامی حلقوں میں بھی بے حد پذیرائی بخشی۔ یہ 1960ء کے آس پاس کا زمانہ ہے جب

انہوں نے ولبھ بھائی پٹیل روڈ (کینڈی بُرج کے قریب) پر رہائش اختیار کی۔ بقول جی۔این۔جوشی یہ بیٹھک ایک ایسے علاقے میں واقع تھی جہاں کوئی بھی شریف آدمی دن کے وقت جاتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔5 دراصل یہ ایک ایسا علاقہ تھا جہاں ناچنے گانے اور دھندہ کرنے والی عورتیں بڑی تعداد میں رہتی تھیں۔ یہاں استاد امیر خان ان میں سے بعض عورتوں کو گانا سکھاتے تھے۔ یہ بیٹھک ایک عمارت کی تیسری منزل پر واقع تھی جہاں ہر وقت فن سے وابستہ افراد کا رش لگا رہتا تھا۔ استاد امیر خان کی اس بیٹھک سے کچھ فاصلے پر گنگا بائی نام کی ایک پُرانی گلوکارہ کی بیٹھک تھی جس میں استاد بڑے غلام علی خان اور استاد احمد خان تھرکوا رہائش پذیر تھے۔ امیر خاں صاحب کی اس بیٹھک میں استاد بڑے غلام علی خاں سے لے کر، کیسر بائی، استاد رجب علی خاں اور استاد اللہ دِیا خاں جیسے موسیقی کے نابغہ ءروزگار افراد کو اکثر آتے جاتے دیکھا جا سکتا تھا۔

استاد کالے خاں کی بیٹھک:

استاد کالے خاں کا تعلق قصور سے تھا اور وہ قصور گھرانے کے نامور گائیک تھے۔ وہ استاد علی بخش خان کے بھائی اور بڑے غلام علی خاں کے چچا تھے۔ قصور شہر کا المیہ یہ ہے کہ اس کے اکثر فنکار لاہور منتقل ہوتے رہے اور لاہور کی ثقافتی زندگی کو ثروت مند بناتے رہے۔ لاہور میں ان کی بیٹھک حویلی میاں خان کے سامنے کٹڑہ نادرہ شاہ میں واقع تھی۔ وہ جب صبح سویرے اُٹھ کر ریاض کرتے تو ان کی سُریلی آواز کی خوشبو محلے میں ہر طرف پھیل جاتی۔ خواتین گھروں میں بیٹھی صبح کے کسی راگ سے لُطف اندوز ہوتیں جبکہ ان کی بیٹھک کے سامنے لوگوں کا ہجوم اُمڈ آتا۔ اُن کی آواز کا لنگر فی سبیل اللہ جاری و ساری رہتا۔ یہ ایک نعمت تھی جو اُس عہد کے بیشتر لوگوں کو نصیب تھی۔

استاد کالے خاں کا معمول تھا کہ وہ صبح اُٹھ کر اپنے ہاتھوں سے گوشت بُھونتے، پکی ہوئی ہنڈیا کو الماری میں رکھتے پھر صابن، تیل اور لنگوٹ کو ایک چھتری میں ڈالتے اور ٹیکسالی دروازے سے باہر واقع کارپوریشن کے باغ میں ورزش کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ یہاں پہنچ کر وہ بدن پر اچھی طرح تیل ملتے اور بیٹھکیں لگانے کے ساتھ ساتھ صبحوں کے راگوں میں سے بھیروں یا ٹوڈی کے ترانے کی تانیں بھی اُڑاتے جاتے، بظاہر یہ عمل تندرستی کو بحال رکھنے اور سانس کو پکّا کرنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ ورزش کرنے کے

بعد وہ نہاتے اور بیٹھک میں واپس آکر تین چار گھنٹے مزید ریاض کرتے اور آخر میں بُھنے ہوئے گوشت کو سیر ہو کر کھاتے۔ اسی زمانے میں وہ اپنے بھتیجے غلام علی خان کی تربیت بھی کر رہے تھے۔ ایک روز انہوں نے خوب دیسی گھی ڈال کر گوشت بُھونا، الماری کو تالہ لگایا اور ورزش کرنے چلے گئے۔ واپس آئے تو محلے کے گھروں میں پولیس تلاشی لیتی پھر رہی تھی۔ رات ہی کسی گھر میں چوری ہوئی تھی اور پولیس چور اور مسروقہ مال کی تلاش میں گھر گھر تلاشی لے رہی تھی۔ جیسے ہی پولیس خاں صاحب کی بیٹھک میں داخل ہوئی وہ جلدی سے اُٹھ کر الماری کے قریب پہنچ گئے۔ پولیس نے الماری کی تلاشی لینے کی کوشش کی تو خاں صاحب نے انکار کر دیا۔ اب تو پولیس کو یقین ہو گیا کہ مالِ مسروقہ اسی الماری میں موجود ہے۔ پولیس اچانک زبردستی پر اُتر آئی تو کالے خاں اُچھل کر الماری کے سامنے آکھڑے ہوئے اور کہا "الماری کے علاوہ آپ سارے کمرے کی تلاشی لے سکتے ہیں" اب تو پولیس کو سو فیصد یقین ہو گیا کہ یہاں ضرور کوئی چیز چھپائی گئی ہے۔ سپاہیوں نے خاں صاحب کو پکڑ کر پَرے ہٹایا، الماری کھولی تو وہاں بُھنے ہوئے گوشت کی ہنڈیا نظر آئی۔ پولیس کے سپاہی پہلے حیران ہوئے اور پھر قہقہے لگاتے ہوئے بیٹھک سے چلے گئے۔ خاں صاحب پیچھے سے پکارے "اب یہ گوشت تمہی کھائو اسے تمہاری نظرِ بد لگ گئی ہے۔"[6]

استاد عبدالوحید خان کی بیٹھک:

عبدالوحید خان فنِ موسیقی کے نامور استاد اور کیرانہ گھرانے کے قابلِ فخر نمائندے تھے۔ اُنہیں کانوں سے کم سنائی دیتا تھا اس لیے گانے بجانے والے لوگ عام طور پر انہیں بہرے خاں کے نام سے یاد کرتے تھے اور بعض لوگوں نے یہ بھی روایت کی ہے کہ گانے سے وابستہ لوگ ان کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگایا کرتے تھے۔ کیرانہ گھرانے کی اقدار سازی اور اس گھرانے کو شہرتِ عام اور بقائے دوام عطا کرنے میں استاد عبدالکریم کے بعد انہی کا نام آتا ہے۔ 1935ء کے آس پاس کے زمانے میں وہ لاہور میں رہائش پذیر تھے اور بازارِ حسن میں ان کی بیٹھک بھی تھی جہاں اپنے شاگردوں کو موسیقی کی تربیت دیا کرتے تھے۔ یہ بیٹھک اس عہد کے صاحبانِ کمال کا گڑھ تھی۔ لاہور کا شاید ہی کوئی گوّیا ہو گا جس نے اس بیٹھک کے پھیرے نہ لگائے ہوں۔ بڑے غلام علی خان، رشید عطرے، فیروز نظامی، چھوٹے غلام علی

خان، بھائی لعل اور استاد توکل حسین خاں جیسے لوگوں کے وجود سے یہ بیٹھک ہمیشہ روشن رہتی۔ استاد عبدالوحید خان نے فیروز نظامی اور ہیرابائی بروڈکر کی تعلیم و تربیت اسی بیٹھک میں کی۔ ایک روز استاد بہرے خاں چلچلاتی دھوپ میں تہہ بند باندھے اور بنیان پہنے اپنی بیٹھک کے باہر ننگے پائوں ٹہل رہے تھے کہ وہاں سے قاضی ظہور 7 کا گزر ہوا۔ وہ موٹر سائیکل پر سوار تھے۔ استاد وحید خاں نے انہیں روکا اور بولے "ارے اس گھوڑے سے تو نیچے اُتر آ" وہ موٹر سائیکل سے نیچے اُترے تو وحید خاں بولے "میں نے اپنی شاگرد ہیرابائی بروڈکر 8 کو نیا خیال یاد کرایا ہے وہ تو سنتے جائو۔" قاضی ظہور موٹر سائیکل سے اُتر کر ان کے ہمراہ ہو لیے۔ وہ ہیرابائی کے گھر کے وسیع و عریض ہال میں پہنچے۔ ہیرابائی نے خندہ پیشانی سے دونوں کا استقبال کیا، خاں صاحب نے تان پورہ سُر کر کے ہیرابائی کے حوالے کیا وہ دیر تک اپنی سُریلی آواز میں راگ ملتانی کا خیال سناتی رہیں۔ 9

ایک روز استاد وحید خاں اپنی بیٹھک میں بیٹھے کسی خیال کی دُھن گنگنا رہے تھے کہ استاد توکل حسین خاں (1902ئ-1958ئ) وہاں آن پہنچے۔ وہ گرم اور جوشیلی طبیعت کے مالک تھے اور ہر وقت مقابلے کے لیے تیار رہتے تھے۔ آتے ہی انہوں نے بہرے خان صاحب کو مقابلے کے لیے للکارا۔ "میرے ساتھ مقابلہ کرو جو ہار جائے وہ جیتنے والے کی شاگردی اختیار کرلے گا۔" وہ بیچارے فقیر منش اور مدبّر انسان تھے اور لڑائی جھگڑوں اور بحث مباحثوں سے دور بھاگتے تھے۔ چنانچہ جب توکل خان صاحب کا اصرار بڑھا تو وحید خاں بولے "جو گانے والا گانے کے دوران تان پورہ استعمال نہیں کرتا میں اسے گائیک نہیں مانتا" یہ کہہ کر قریب پڑے تان پورے کی چاروں تاریں ڈھیلی کر دیں اور تان پورہ ان کی طرف بڑھا دیا۔ اب یہ بات تو موسیقی کے حلقے سے وابستہ ہر شخص جانتا ہے کہ استاد توکل حسین خاں تان پورے کی بجائے ہارمونیم کے ساتھ گاتے تھے۔ بہرے خاں بولے "پہلے تان پورہ سُر کرو پھر میرے مقابلے میں گائو، اس کے بعد استادی اور شاگردی کی بات کریں گے۔" بہرے خان کی بات سن کر توکل خاں بہت مایوس ہوئے اور خاموشی سے اُٹھ کر چلے گئے۔ 10 اور یوں اس بیٹھک میں گانے کی ایک معرکہ آراء محفل سجتے سجتے رہ گئی۔

استاد عبدالکریم خاں کی بیٹھک: (1872ئ-1947ئ)

کیرانہ گھرانے کے وہ عظیم فن کار جنہوں نے اپنی منفرد آواز اور اجتہادی فکر سے کلاسیکی موسیقی پر کئی احسانات کیے اور اپنے گھرانے کو کچھ ہی عرصے میں برصغیر کے بڑے گھرانوں کے مدمقابل لا کھڑا کیا وہ استاد کریم خان ہیں۔ وہ 1872ء میں کالے خاں کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے والد اور چچا عبداللہ خان اپنے عہد کے نامور گائیک تھے۔ استاد کریم خاں کا گھرانہ اپنے نامور طبلچیوں، ستاریوں اور سارنگی نوازوں کے لیے مشہور تھا مگر انہوں نے اپنے لیے ساز کی بجائے آواز کا انتخاب کیا۔ تربیت کے ابتدائی زمانے میں سارنگی سے وابستگی ان کی آواز میں ہمیشہ محسوس کی جاسکتی تھی۔ کریم خاں صاحب کا ہندوستانی موسیقی پر ایک احسانِ عظیم یہ ہے کہ انہوں نے شمالی اور جنوبی ہند کی موسیقی کے درمیان نئے رابطے اور اشتراکات تلاش کیے۔ انہوں نے موسیقی کو ملکہء موسیقی روشن آراء بیگم جیسا تحفہ دیا۔ آج ہندوستان کے بیشتر گویّے استاد کریم خاں کے شاگرد ہیں یا پھر ان کے شاگردوں کے شاگرد۔

ابتداء میں استاد کریم خاں کی بیٹھک کیرانہ میں تھی اور دلّی کے قریب واقع اس چھوٹے سے گاؤں میں آباد اس بیٹھک کی طرف سارا ہندوستان دیکھتا تھا۔ دور دور سے گویّے اس بیٹھک کا رُخ کرتے اور یہاں رنگ رنگ کا گانا ہوتا۔ استاد کریم خاں کی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان کے جنوبی شہروں میں گزرا چنانچہ ان کی بیٹھک بڑودہ، بمبئی، کلکتہ، ہبلی، دھروار، سولاپور، پُونہ اور آخر میں مراج پہنچی۔ یہ بیٹھک جہاں بھی منتقل ہوئی شاگردوں اور موسیقی سے محبت کرنے والوں کا ایک پورا لشکر ان کے ہمراہ ہوتا۔ آدھ درجن سے زائد شہروں میں زندگی بسر کرنے کے باوجود وہ شاگردوں کی طرف سے کبھی غافل نہ ہوئے۔ بڑے بڑے نامور گائیک جب ان سے ملنے آتے تو ان کے درمیان موسیقی کے اسرار و رموز کے حوالے سے نہایت عالمانہ بحثیں ہوتیں۔ چنانچہ استاد عبدالکریم خاں نے شاگردوں کو تاکید کر رکھی تھی کہ وہ ان مباحث کو پوری توجہ سے سنیں تاکہ ان کے علم میں اضافہ ہو۔ ان کے عہد کے بعض بڑے گویّے ان کے رشتہ دار تھے۔ وہ جب خاں صاحب سے ملنے آتے تو یہ ایّام شاگردوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے بڑے زرخیز ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ اس دوران اس بیٹھک میں سارا سارا دن محفلیں جمتیں اور اسی طرح اساتذہ کے سامنے شاگردوں کو بھی اظہارِ فن کے مواقع میسر آتے رہتے۔ ایک بار نامور فن کار حیدر خاں (کولہاپور) اور رحیم بخش خان (حیدر آباد) خان صاحب سے ملنے آئے اور کئی مہینے تک ان

کے ہاں قیام کیا۔ اس دوران نہ صرف گانے کی درجنوں محفلیں برپا ہوئیں بلکہ ان اساتذۂ فن کے درمیان ہونے والی گفتگو سے بھی فن کے بہت سے قیمتی موتی شاگردوں کے ہاتھ آئے۔

استاد عبدالکریم خاں کی بیٹھک موسیقی سے وابستہ خواتین و حضرات کے لیے درس گاہ کا درجہ رکھتی تھی مگر انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ موسیقی کی ایک باقاعدہ درس گاہ بھی قائم کی۔ موسیقی کے اس کالج کا نام آریا سنگیت ودیالہ آف پُونا تھا۔ موسیقی کے ایک نامور نقاد بی۔ آر۔ دھر دیو کے بقول یہ کالج پنڈت وشنو ڈگمبر کے مہاوِدیالہ سے گہری مماثلت رکھتا تھا۔ آریا سنگیت ودیالہ میں داخلے کی شرط یہ تھی کہ موسیقی سیکھنے والا ہر طالب علم مسلسل سات برس تک اس ودیالے میں قیام کے لیے تحریری حلف نامہ جمع کرائے گا۔ اس کالج کے بیشتر طلبہ وطالبات کا تعلق غریب گھرانوں سے ہوتا تھا اس لیے ان کے قیام وطعام کا سارا خرچہ ادارہ ہی برداشت کرتا تھا۔ خان صاحب نہ صرف ان کے تعلیمی اخراجات برداشت کرتے بلکہ ان طالب علموں کو تعلیم بھی نہایت فراخدلی سے دیتے۔ خاں صاحب کے شاگردوں کی پورے ہندوستان میں بیٹھکیں پھیلی ہوئی تھیں وہ سارا سال ان بیٹھکوں کے دورے کرتے، اس دوران موسیقی کی محافل بھی برپا ہوتی رہتیں۔ ان محفلوں میں ان کے شاگرد جلترنگ، طبل رنگ، گھنٹی ترنگ، شہنائی اور رقص سے سامعین کی تواضع کرتے اور آخر میں استاد عبدالکریم خاں کا گانا ہوتا۔ خاں صاحب نے 1917ء میں اپنے کالج کی ایک شاخ بمبئی میں بھی قائم کی مگر 1920ء میں بعض وجوہ کی بناء پر اسے بند کرنا پڑا۔ 11 آخری عمر میں انہوں نے مراج میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور یہاں وہ ساری زندگی موسیقی کی خدمت کرتے رہے۔ ان کے گھر کے قریب کسی بزرگ کا مزار تھا جن سے انہیں بے حد عقیدت تھی۔ ان کے عرس کے موقعہ پر وہ موسیقی کی ایک شاندار محفل منعقد کراتے جس میں بڑے بڑے گائیک شریک ہوتے۔ وہ اپنے گھر پر شاگردوں کے درمیان موسیقی کے مقابلے کراتے رہتے اور اچھی پرفارمنس دینے والوں میں اپنی جیب سے انعامات تقسیم کرتے، کسی کو نیا جوڑا، کسی کو کوئی ساز اور کسی کو پگڑی اور کسی کو نقدی انعام میں ملتی اور یوں ان مقابلوں اور خاں صاحب کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں موسیقی کو فروغ حاصل ہوتا۔ استاد عبدالکریم بڑے مہمان نواز اور ملنسار تھے۔ ان کی ہر چھوٹے بڑے فن کار سے یاریاں تھیں۔ گویّوں کے ساتھ ساتھ ساز بنانے والوں میں بے حد مقبول

تھے۔ انسان دوست ایسے کہ شاگردوں کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھتے۔ روشن آراء بیگم، سُریش بابومانے، ہیرابائی، بھیم شیں جوشی اور گنگوبائی ہنگل جیسے گائیک ان کے شاگرد ہیں۔

استاد فتح علی خاں اور استاد علی بخش خاں کی بیٹھک:

علیا فتو کے نام سے مشہور ان دونوں فنکاروں نے پٹیالہ گھرانے کو گھرانے کے درجے پر فائز کرنے کے لیے دن رات کام کیا۔ دونوں کی انتھک کوششوں سے پٹیالہ گھرانہ پنجاب کے چار بڑے گھرانوں میں شمار ہوا۔ علیا فتو نے موسیقی کی تعلیم چار مختلف گھرانوں کے اساتذۂ فن سے حاصل کی۔ اس سے پہلے استاد کالو خان نے دونوں کو تعلیم و تربیت کے لیے گوکی بائی کے حوالے کیا تھا۔ گوکی بائی نے ایک پُرانا حساب چکانے کے لیے دونوں کو آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے درباری گائیک استاد تان رَس خاں کے مقابلے میں اُتارنے کی کوشش کی مگر دونوں نوجوانوں نے اُلٹا خاں صاحب سے انہیں اپنی شاگردی میں لینے کی درخواست کر دی۔ دونوں بھائی دہلی گھرانے کے استاد تان رس خان کے علاوہ گوالیار گھرانے کے حدو حسو خان، جے پور گھرانے کے استاد مبارک خان اور سینی گھرانے کے استاد بہادر خان کے بھی شاگرد ہوئے اور یوں ان کی گائیکی میں چاروں بڑے گھرانوں کی گائیکی کے اسالیب دیکھے جاسکتے تھے۔ پٹیالہ کے مہاراجہ نے انہیں اپنی سرپرستی میں لیا تو ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

پٹیالہ میں واقع ان کی بیٹھک پورے ہندوستان کے گوّیوں کے لیے خاص کشش رکھتی تھی۔ آئے دن یہاں نامور گوّیوں کے اکٹھ ہوتے اور موسیقی کی شاندار محفلیں برپا ہوتیں اور یوں فن موسیقی کو فروغ ملتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب استاد فتح علی خاں اور استاد علی بخش خاں بڑے بڑے گوّیوں کے مقابل گا رہے تھے اور میدان پر میدان مارتے چلے جا رہے تھے۔ ان کی ناموری کا شہرہ سن کر بڑے بڑے گھرانوں کے فن کار ان کی شاگردی میں آنے کے لیے بیقرار تھے۔ اسی بیٹھک میں قصور گھرانے کے علی بخش خاں اور ان کے بھائی کالے خاں (بڑے غلام علی خاں کے والد اور چچا) ان کے شاگرد ہوئے۔ ان کے علاوہ میاں جان خاں، بھائی اروڑہ، سردار بائی اور گوالیار کے پیارے خاں (استاد امید علی خاں کے والد) نے اسی بیٹھک میں شاگردی کا اعلان کیا۔ ایک روایت کے مطابق جب علی بخش خان اور کالے خاں (قصوری) پٹیالہ والوں کے شاگرد ہوئے تو قصور گھرانے کے بزرگوں میں شدید ردِ عمل سامنے آیا مگر اب تیر کمان

سے نکل چکا تھا۔ گوالیار کے پیارے خان کے شاگرد ہونے والا قصہ خاصہ دلچسپ ہے۔ استاد پیارے خاں کو اپنے گھرانے (گوالیار) کی گائیکی پر بڑا ناز تھا۔ نواب آف خیر پور اُن کے بڑے قدردان تھے لہٰذا پیارے خاں صاحب بڑے بڑے گوّیوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ مگر شکار پور میں منعقدہ موسیقی کی ایک محفل میں انہوں نے جب استاد علی بخش اور فتح علی خاں کو سنا تو ان کی شاندار گائیکی پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ دل میں ان کی شاگردی کا تہیہ کر لیا اور کچھ ہی عرصے بعد سیدھے پٹیالہ جا پہنچے اور علیا فتو کے گنڈہ بند شاگرد بن گئے۔ اس زمانے میں پٹیالہ والوں کی بیٹھک شاگردوں سے بھری رہتی۔ استاد صبح و شام اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے، صبح کو جو اسباق دیئے جاتے وہ شام کو سنے جاتے، گویا یہ بیٹھک کم اور درس گاہ زیادہ لگتی تھی۔ یوں تو اس بیٹھک میں ہندوستان کے ہر علاقے سے آئے ہوئے شاگرد موجود تھے مگر پنجاب سے آئے ہوئے شاگردوں کا یہاں غلبہ تھا۔ بیشتر شاگرد خوبصورت، تندرست اور نوجوان تھے اس لیے استاد علی بخش خاں کو خیال گزرا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ خوبصورت شاگردوں کو پٹیالہ کی طوائفیں لے اُڑیں۔ چنانچہ ذہن میں یہ خیال آتے ہی تمام شاگردوں کو گندم کی جگہ باجرے کی روٹی دینی شروع کر دی اور ساتھ بُھنے ہوئے گوشت میں مصالحے اس قدر تیز کر دیئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے سارے شاگردوں کے ہاضمے خراب ہو گئے اور چند ہی روز میں تر و تازہ لڑکے سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ اس پر بھی استاد کے اندیشوں میں کمی نہ آئی تو حجام کو بُلوا کر تمام شاگردوں کی ٹنڈیں کروا دیں۔ چنانچہ پیارے خان اس عجیب و غریب اور ڈرائونے حُلیے میں جب حیدرآباد واپس پہنچے تو رات کا وقت تھا، بیوی نے پیارے خاں کو سامنے دیکھ کر شور مچانا شروع کر دیا۔ چنانچہ بڑی مشکل سے شناخت پریڈ کرانے کے بعد پیارے خان گھر داخل ہونے میں کامیاب ہوئے۔12؎

استاد اللہ دِیا خاں کی بیٹھک:(1855ئ-1946ئ(

جے پور گھرانے کے نامور فن کار استاد اللہ دِیا خاں 1855ء میں استاد احمد خاں کے گھر پیدا ہوئے جو اپنے عہد کے اہم گائیک اور نواب آف ٹونک کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کے اَباواجداد دلّی کے قریب کسی ریاست سے منسلک تھے مگر بعد ازاں یہ خاندان دلّی سے راجستھان منتقل ہو گیا۔ استاد اللہ دِیا خاں کا اصل نام غلام احمد تھا مگر آج جس نام سے وہ جانے جاتے ہیں یہ نام انہیں اپنے آس پاس کے لوگوں کی طرف

سے تحفے میں ملا تھا۔ قصہ یوں ہے کہ استاد صاحب کے سارے بھائی اپنی پیدائش کے ابتدائی مراحل ہی میں اللہ کو پیارے ہو جاتے تھے۔ تب ان کے گھرانے کے کسی روحانی مرشد نے ایک طویل چلّہ کاٹ کر اس خاندان کو اس مشکل سے نکالا۔ غلام احمد جب موت کے منہ سے بچ نکلا تو محلے کے لوگوں نے خود ہی انہیں اللہ دِیا خاں کہنا شروع کر دیا اور آگے چل کر یہی نام موسیقی کی دنیا میں ان کے لیے شناخت کا باعث بنا۔

اللہ دِیا خاں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی لیکن ان کی وفات کے بعد وہ اپنے چچا جہانگیر خان کے شاگرد ہوئے۔ چچا نے انہیں پہلے دُھرپد اور پھر خیال کی تعلیم دی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے چچا کے ساتھ جے پُور پہنچے یہاں اِسی عہد کے نامور گائیک استاد مبارک خان اور کلّن خان جیسے اساتذۂ فن موجود تھے۔ اُستاد مُبارک خاں نے اللہ دِیا خاں کو سنا تو شاگردی میں لینے کی خواہش کا اظہار کیا، اللہ دِیا خاں بھی دل سے یہی چاہتے تھے مگر خاندان کی غیرت آڑے آئی۔ وہ اُستاد مُبارک خان کے شاگرد تو نہ بن سکے مگر وہ ان کے گانے پر بُری طرح فریفتہ ہو چکے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ ساری زندگی اُستاد مُبارک خان ہی کے انگ میں گاتے رہے۔ یہ مُبارک خاں صاحب کے گائیکی کے اسلوب کے لیے ایک طرح کا خراجِ تحسین ہی تھا۔ جے پُور میں استاد اللہ دِیے خاں کی بیٹھک مرجعِ خاص و عام تھی۔ اس عہد کے بڑے بڑے گویّے اسی بیٹھک کا طواف کرتے نظر آتے۔ وہ بہت سے دیگر اساتذۂ فن کے برخلاف شاگردوں کو غلام سمجھنے کی بجائے ان سے بے حد محبت سے پیش آتے، ان کی ضرورتوں پر نظر رکھتے اور ان کی تعلیم کا خاص خیال رکھتے۔ جے پُور میں وہ کچھ ہی عرصہ ٹھہر پائے تھے کہ نیپال کے بادشاہ کے بُلاوے پر وہ تین سو روپے ماہوار پر نیپال کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ نیپال میں انہوں نے دو سال قیام کیا مگر یہاں بھی ان کی بیٹھک موسیقی کے چاہنے والوں سے ہمیشہ آباد رہتی تھی۔ بعد ازاں وہ رتلم اور اَملتا کی ریاستوں سے بھی وابستہ ہوئے مگر یہاں بھی وہ اپنے شاگردوں اور ان کی تعلیم کی طرف سے کبھی غافل نہ ہوئے۔

1895-96ء کے درمیان وہ ریاست کولہا پور کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ یہاں کے راجا ان پر جان چھڑکتے تھے اور انہیں اپنے دربار سے تادیر وابستہ رکھنے کے لیے راجا نے اُستاد اللہ دِیا خان کو بہت نوازا،

ان کے بھائی حیدر بخش کو درباری گویّے کی حیثیت دی، ایک بیٹے منجھی 13؎ خاں کو زمین دی جبکہ چھوٹے بیٹے بھورجی 14؎ کو محکمہ جنگلات میں بھرتی کیا۔ اس زمانے میں رجب علی خان (دیوداس والے) بھی وہیں تھے، وہ چھپ چھپ کر خاں صاحب کا گانا سنتے اور اسے یاد کیا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ عمل زیادہ دیر تک پوشیدہ نہ رہ سکا اور بالآخر رجب علی خاں کے گانے سے استاد اللہ دِیا خاں کی گائیکی نے اپنا چہرہ دکھانا شروع کر دیا۔ یہاں بھی شاگردوں کا ایک حلقہ ان سے اِستفادہ کر رہا تھا مگر راجا کی موت کے بعد خاں صاحب نے دربار کی ملازمت چھوڑ دی اور بمبئی منتقل ہو گئے۔

اللہ دِیا خاں کی بیٹھک دہلی سے جے پور، نیپال، رَتلم، اَملتا اور کولہا پور سے ہوتی ہوئی بالآخر بمبئی منتقل ہو گئی۔ بمبئی میں یہ بیٹھک بالی ہاؤس میں تھی کیونکہ خاں صاحب اپنے ایک مربیّ بابو صاحب گنکلر کے ساتھ یہیں رہ رہے تھے۔ اسی بیٹھک میں شنکر رائو سرنائیک پنڈت بھاسکر بُوا باکھلے، چندابائی، لیلاشر گائونکر، لکشمی بائی، مگوبائی (جو اگرچہ حیدر خاں کی شاگرد تھیں) اور کیسر بائی (جنہوں نے مسلسل سترہ برس تک ان سے تعلیم حاصل کی) سیکھنے آیا کرتی تھیں۔ تمام شاگردوں میں کیسر بائی واحد شاگرد تھیں جنہوں نے شاگردی کے لیے بہت جتن کیے مگر وہ مسلسل انکار کرتے رہے بالآخر انہوں نے سیٹھ دُنی چند (کلکتے والے) اور سیٹھ دُھل داس سے کہلوایا تب کہیں جا کر 1912ء میں اللہ دِیا خاں نے کیسر بائی کو پُونا میں شاگرد کیا۔ اس دوران خرابیٔ طبیعت اور تبدیلیٔ آب و ہوا کے لیے مختلف شہروں میں قیام پذیر رہے مگر ان کے شاگرد ہر جگہ ان کے ہمراہ ہوا کرتے اور سیکھنے سکھانے کا عمل ہر جگہ جاری و ساری رہتا۔ اللہ دِیا خان شاگردوں کو ٹائم ٹیبل کے مطابق سکھاتے، راگوں کی مسلسل مشقیں کراتے، پہلے خود راگ کی آروہی امروہی کہتے اور شاگرد ساتھ ساتھ دہراتے تھے۔ یہ عمل سینکڑوں مرتبہ دہرایا جاتا، جب تک ایک ٹکڑا ازبر نہ ہو جاتا اگلا سکیل یاد نہ کراتے، جو راگ صبح یاد کراتے شام کے سبق کے لیے اسی ٹھاٹھ کا کوئی اور راگ منتخب کرتے۔ اللہ دِیا خاں کے سلسلے میں ایک تخصیص یہ ہے کہ بڑے بڑے گویّے ٹیوشن ادا کر کے ان سے سیکھنے آیا کرتے تھے۔ انہیں نہ صرف خود نئے نئے راگ گانے کا شوق تھا اور وہ ایک محفل میں سات سات راگ گا دیا کرتے تھے بلکہ شاگردوں کو بھی نئے نئے راگ یاد کرایا کرتے تھے۔ گذشتہ صدی کی دوسری دہائی تک ہر طرف چالیس پچاس راگ ہی گائے

جاتے تھے مگر خان صاحب نے سننے والوں کو نئے نئے راگوں سے متعارف کرایا۔ ان کا ایک اختراعی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بے شمار دُھرپدوں کو خیال میں تبدیل کیا اور پھر خیال کی ان بندشوں کو اپنے شاگردوں تک بھی منتقل کیا۔ استاد اللہ دِیا خان شاگردوں کی آواز کی تراش خراش پر خصوصی توجہ دیتے تھے، مدھم لے میں تانوں کا زبردست ریاض کراتے (جے پور گھرانہ ویسے بھی اپنی تانوں کے لیے مشہور ہے) ان کا کہنا تھا کہ اس سے آواز نکھرتی ہے اور سانس پکّا ہوتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو اللہ دِیا خان اُن چند اساتذۂ فن میں سے تھے۔ جو اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیا کرتے تھے۔

بندُو خاں کی جھگی:

یہ گزشتہ صدی کے نصف اول کا معرُوف طبلہ نواز تھا۔ اس کی بیٹھک لاہور کی شاید سب سے زیادہ بارونق بیٹھک تھی مگر اسے جھگی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ بادشاہی مسجد کا جو دروازہ ہیرا منڈی کی طرف کھلتا ہے اس کے ساتھ ہی یہ جھگی واقع تھی۔ بندو خان طبلہ نوازی کے حوالے سے ایک اہم نام تھا اور موصوف اس میدان میں ممتاز طبلہ نواز استاد نبی بخش کالرے والے کے شاگرد تھے۔ یہ جھگی پنجاب کے نامور طبلہ نوازوں اور گویّوں کا گڑھ تھی۔ سارا دن یہاں فنِ موسیقی سے وابستہ لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا اور جب بھی دیکھو یہاں گانے بجانے کی محفل سجی ہوئی ملتی۔ کبھی یہاں کلاسیکل سننے کو ملتا تو کبھی انڈو پاک کے بڑے بڑے سازندے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے۔ اس جھگی میں نامور طبلہ نوازوں، ستاریوں، بانسری نوازوں، سارنگی نوازوں، سرود نوازوں اور پکھاوج بجانے والوں نے اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ اس جھگی میں ہر وقت ساز اور سازندے موجود ہوتے جونہی کوئی گویّا یہاں آتا لوگ اُس کا گانا سننے کے لیے جمع ہو جاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے گانے کی محفل سج جاتی۔ یہ جھگی ایک طرح کی تفریح گاہ، درس گاہ اور مجلس کدہ تھی۔

قیامِ لاہور کے زمانے میں استاد بڑے غلام علی خاں نے اس جھگی میں قیام کیا۔ یہ ان کے سیکھنے کے دن تھے چنانچہ ان کے چچا استاد کالے خاں اسی جھگی میں اپنے ہونہار بھتیجے کو ریاض کرایا کرتے تھے۔ وہ غلام علی خاں کو لے کر جھگی کے باہر قلعہ کی دیوار کے برابر کھڑے ہو جاتے۔ کالے خاں پہلے خود تان لگاتے

پھر غلام علی خاں سے کہتے کہ ''اس طرح زوردار تان لگائو کہ دیوار سے ٹکرا کر تان کی بازگشت تمہیں سنائی دے'' پھر وہ دونوں تانوں کا تجزیہ کر کے بھتیجے کو بتاتے کہ اُس کی تان کہاں سے کمزور اور بے سُری ہے۔ ریاض کا یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ بندو خاں کی جھگی کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں شام ہوتے ہی عام لوگوں کے ساتھ ساتھ لاہور کے بڑے بڑے رئوسا، امرائ، شاعر، صحافی، پروفیسر اور تاجر گانا سننے آتے تھے۔ اب اس جھگی کا نام ونشان مٹ چکا ہے۔

نبی بخش کالرے والے کی بیٹھک:(1840ئ-1948ئ(

بندُو خاں (طبلہ نواز) کا ذکر ہوا تو انڈو پاک کے ایک اور نامور طبلہ نواز استاد نبی بخش کالرے والے کی بیٹھک کا بھی ذکر کرتے چلیں۔ 1840ء میں جنم لینے والے نبی بخش کا تعلق گجرات سے دو میل دور واقع گائوں کالرے والا سے تھا۔ انہوں نے طبلے کی تعلیم استاد فتح دین سے حاصل کی جن کا تعلق طبلے کے پنجاب گھرانے سے ہے۔ ان کے شاگردوں میں میاں کرم الٰہی قصوری، میاں میراں بخش گِل والیا اور میاں طفیل نارووالیے بہت نمایاں ہیں۔ یہ اعزاز پنجاب گھرانے کو حاصل ہے جس نے طبلہ نوازی میں سولو کی روایت قائم کی۔ اس گھرانے کا ایک اور افتخار یہ ہے کہ طبلے کے سارے معروف گھرانوں (دہلی، لکھنو، بنارس، فرخ آباد، اجڑاڑا) کا سلسلہ جا کر دہلی گھرانے سے ملتا ہے لیکن پنجاب واحد گھرانہ ہے جو اپنی آزادانہ حیثیت رکھتا ہے۔15 استاد اللہ رکھا، استاد ذاکر حسین خاں، میاں شوکت حسین خاں، استاد عبدالستار تاری اور استاد طافو خاں سبھی پنجاب گھرانے کے نمایاں فن کار ہیں۔ گت، توڑا، پرن یا ریلا اس گھرانے کے خصوصی امتیازات ہیں۔ استاد نبی بخش کو طبلے کا شاعر کہا جاتا ہے۔ انہوں نے طبلہ بجایا ہی نہیں بلکہ طبلہ ایجاد بھی کیا۔ موصوف نے طبلے کے میدان میں بہت سی اختراعات کیں۔ نئی گتیں، قاعدے اور پیش کاریں تخلیق کیں۔ گجرات میں واقع ان کی بیٹھک ہندوستان بھر کے گانے بجانے والوں کی توجہ کا مرکز تھی۔ بالخصوص برصغیر کے طول و عرض سے طبلہ بجانے والے نئے اور نامور فن کار اس بیٹھک میں جمع ہوتے، بعض لوگوں کے مطابق یہ بیٹھک پنجاب میں طبلہ نوازی کی ایک عظیم درس گاہ تھی جس سے درجنوں فن کاروں نے فیض حاصل کیا۔ سالہا سال یہاں فن کا فیض بانٹنے کے بعد استاد نبی بخش کالرے والے بالآخر امرتسر منتقل ہو گئے۔ یہ شہر موسیقی کے ذوق کے حوالے سے

خصوصی شہرت رکھتا تھا۔ گجرات میں یہ بیٹھک ویران ہوئی مگر امرتسر پہنچ کر نئے سرے سے آباد ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سیکھنے والوں کا ایک ہجوم یہاں بھی جمع ہو گیا اور استاد نبی بخش ایک بار پھر موسیقی کی تدریس میں مصروف ہو گئے۔ امرتسر میں انہوں نے بعض نامور شاگرد پیدا کیے جن میں فضل دیں، ہدایت خاں اور علی بخش ٹانڈے والیا کے نام بطورِ خاص لیے جاسکتے ہیں۔ امرتسر میں انہوں نے پورے پانچ سال قیام کیا اور یہاں کے ممتاز ترین گائیک استاد بھائی لعل سے ان کے قریبی مراسم رہے اور انہوں نے درجنوں محفلوں میں ان کے ساتھ سنگت کی۔ پانچ سال امرتسر میں گزارنے کے بعد وہ ایک بار پھر گجرات واپس آ گئے۔

استاد نبی بخش کو طبلے کے علاوہ گانے اور شعر کہنے کا بھی شوق تھا۔ انہوں نے خیال کی کئی بندشیں تخلیق کیں جن میں وہ عبدلؔ تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے "پستک تال پَرن" کے نام سے طبلے پر ایک کتاب بھی لکھی جس کا مسوّدہ تاحال شائع نہیں ہو سکا۔ استاد نبی بخش نے عمر کا آخری حصہ لاہور میں بسر کیا۔ یہاں ہیرا منڈی میں انہوں نے ایک بیٹھک کرایہ پر لی اور فن کے متلاشی لوگوں کو تعلیم دینے کا آغاز کیا۔ ان سے فیض حاصل کرنے والوں میں استاد اللہ بخش حضروی، اعجاز حسین حضروی، ماسٹر صادق (پنڈی والے)، کریم بخش پیرانہ اور اللہ دتہ بہاری پوری کے نام شامل ہیں۔ لاہور میں واقع ان کی بیٹھک میں بڑے بڑے موسیقار اور طبلہ نواز دیکھنے کو ملتے۔ طبلہ نوازی، گلوکاری اور شاعری سے بیک وقت شغف نے ان کی شخصیت میں ایک خاص کشش پیدا کر دی تھی۔ بڑے بڑے نامور گوئیّے ان سے موسیقی کے رموز پر گفتگو کرنے آتے اور اپنے فکری مغالطے دور کر کے واپس لوٹتے۔ ان سے استفادہ کرنے والوں میں استاد بڑے غلام علی خاں جیسے فن کار بھی شامل تھے۔ ایک بار انہیں ریڈیو پاکستان لاہور سے راگ "دیوگندھار" گانے کے لیے کہا گیا مگر وہ راگ کے صحیح روپ سروپ کے بارے میں تشکیک کا شکار تھے چنانچہ وہ مشورہ کرنے کی غرض سے استاد نبی بخش کی بیٹھک میں آئے اور راگ میں اصلاح کی درخواست کی۔ تب استاد نبی بخش نے ان کے سامنے گا کر راگ کی شکل واضح کی اور یوں استاد بڑے غلام علی خان پوری طرح مطمئن ہو کر واپس لوٹ گئے۔ اس بیٹھک میں اس قسم کے معاملات روزانہ کی بنیاد پر پیش آتے تھے اور استاد نبی بخش بڑی فراخدلی سے فن کاروں کی راہنمائی کا فریضہ انجام

دیا کرتے تھے۔ آگرچہ آخری عمر میں وہ بیمار رہنے لگے تھے مگر موسیقی کی درس و تدریس کا سلسلہ مرتے دم تک جاری رہا۔ سنا ہے یہ بیٹھک استاد نبی بخش سے پہلے استاد برکت علی خاں کے پاس تھی۔ آج کل یہ بیٹھک نہایت خستہ حالت میں ہے۔16؎

بیٹھک کلچر کسی ایک شہر سے مخصوص نہ تھا بلکہ ایسی بیٹھکیں برصغیر کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے اور نامور گویّوں کے متوازی بہت سے کم معروف اور شوقیہ فنکاروں کی بیٹھکیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ راولپنڈی میں ماسٹر صادق پنڈی والے کی بیٹھک، ٹھمری اور غزل کے نامور گائیک اعجاز حسین حضروی (1929ئ-1989ئ) کی بیٹھک جو کہ راجا بازار کے تاج ہوٹل میں تھی اور یہاں مہدی حسن، طفیل نیازی اور قاضی ظہور جیسے فنکار جمع ہوا کرتے تھے، پھر اسی شہر میں جامع مسجد روڈ پر موسیقار رفیق غزنوی کی بیٹھک ہوا کرتی تھی جہاں اس عہد کے بڑے بڑے فنکار آیا کرتے تھے۔ اسی طرح لاہور میں استاد مبارک علی خاں (سارنگی نواز) کی بیٹھک تھی جو استاد بڑے غلام علی خان اور استاد اللہ دِیا خاں (سارنگی نواز) کے شاگرد تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل یہ بیٹھک لاہور میں سازندوں کا گڑھ سمجھی جاتی تھی۔ لاہور ہی میں موسیقار سلیم اقبال کی بیٹھک بھی خاصی شہرت کی حامل تھی، اندرون لاہور میں بابے ابراہیم جاٹ اور ابرار جاٹ کی بیٹھکیں بھی اپنی رونقوں کے اعتبار سے یادگار تھیں۔17؎ یہیں پر ایک بیٹھک خورشید بٹ کی بھی تھی۔ یہ بیٹھک بھاٹی دروازے کے اندر امام بارگاہ مبارک بیگ کی چار دیواری کے قریب واقع تھی، ایک بیٹھک گنجِ شہداں چوک کے تکیہ سادھوواں میں ہوتی تھی اور ایک اور بیٹھک تکیہ مراثیاں میں تھی۔ جہاں شوقیہ فنکاروں کے علاوہ بڑے غلام علی خاں، استاد توکل حسین خاں، استاد امیر علی خاں، استاد سلامت علی خاں، استاد عاشق علی خاں اور ملکہء موسیقی روشن آراء بیگم جیسے گویّے گانے آیا کرتے تھے۔ اندرونِ لاہور میں پٹیالہ گھرانے کی بیٹھک تھی جہاں ہر وقت آسمانِ موسیقی کے روشن ستاروں کی کہکشاں جگمگایا کرتی تھی۔ یہیں ایک زمانے میں شام چوراسی گھرانے کے نامور گائیک استاد سلامت علی خاں اور نزاکت علی خاں کی بیٹھک تھی جو اُس عہد کے نامی گرامی گویّوں کے وجود سے چھلکتی رہتی تھی۔ ایک بیٹھک این سی اے کے اندر بھی سجتی تھی جہاں چھوٹے غلام علی خاں، پرویز پارس اور فہیم مظہر جیسے فن کار بیٹھا کرتے تھے۔ لاہور کی ایک اور

یادگار بیٹھک ماسٹر سوہنی خاں کی تھی جہاں استاد سلامت علی خاں، استاد نزاکت علی خاں، استاد صادق مانڈو، بندے خاں، استاد توکل حسین خاں اور دوسرے نامور گویّے بیٹھا کرتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو دلّی، ریڈیو کراچی، ریڈیو ملتان، ریڈیو کلکتہ اور ریڈیو بمبئی اور ریڈیو پاکستان لاہور کی کینٹین کا مقام بھی کسی بیٹھک سے کم نہ تھا جہاں اس عہد کے بڑے بڑے فن کار روزانہ جمع ہوتے اور موسیقی کے دقیق مسائل پر بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ لاہور سے باہر بہاولپور میں استاد توکل حسین خاں کی بیٹھک، حیدر آباد میں استاد فتح علی خان کی بیٹھک، کراچی میں استاد نصیر الدین سامی کی بیٹھک، فیصل آباد میں استاد مبارک علی خاں، استاد فتح علی خاں کی بیٹھک، ملتان میں ثریا ملتانیکر کی بیٹھک، قصور میں استاد بڑے غلام علی خاں کے خاندان کی بیٹھک، امرتسر میں بھائی لعل کی بیٹھک، دلّی میں دلّی گھرانے کے استاد تان رس خاں کی بیٹھک، آگرہ کے استاد کھگے خدا بخش اور استاد فیاض خاں کی بیٹھک، جے پور کے استاد من رنگ خاں کی بیٹھک، بمبئی کے بھنڈی بازار میں استاد چھجو خان، استاد نذیر حسین خاں اور استاد خادم حسین خاں کی بیٹھک، رام پور کے استاد عنایت حسین خاں کی بیٹھک اور سہسوان کے استاد حفیظ خاں کی بیٹھک (جو انڈیا کی اکلوتی میوزیکل یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے)۔ گویا بیٹھکوں کی ایک کہکشاں تھی جو برصغیر کے ایک سے دوسرے سر تک پھیلی ہوئی تھی۔ کلاسیکی موسیقی کی یہ عظیم بیٹھکیں اگرچہ اب بھی خال خال نظر آتی ہیں مگر ان کی فعالیت اور تحرک کا زمانہ کب کا گزر چکا۔ بیسویں صدی کے ربعی آخر تک آتے یہ ثقافتی بیٹھکیں اُجڑنا شروع ہو گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ بیٹھکیں صدیوں تک اپنا تاریخی اور تخلیقی کردار ادا کرنے کے بعد فنا کے گھاٹ اُتر گئیں۔ آج جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ہماری تخلیقی زندگی کے ان مظاہر کے زوال کے متعدد اسباب نظر آتے ہیں۔

1- قیامِ پاکستان ایک ایسا سانحہ تھا جس کے نتیجے میں ہزاروں سالوں سے ایک ہی روش پر چلنے والی سماجی و ثقافتی زندگی کے اچانک پائوں اُکھڑ گئے تھے۔ نیا ملک جن علاقوں پر مشتمل تھا وہاں سے لاکھوں لوگوں کو ہجرت کے عمل سے گزرنا پڑا اور یوں لُٹ پٹ کر آنے والے لوگ ایک عرصے تک دال روٹی اور سر چھپانے جیسے مسائل میں اُلجھے رہے اور یوں مدت تک موسیقی کی طرف دیکھنے کی کسی کو فرصت ہی نہ ملی جبکہ وسیع و عریض ہندوستان میں اس سماجی کروٹ سے بہت ہی کم لوگ اور علاقے متاثر

ہوئے اور ان کی زندگی پرانے راستے پر رواں دواں رہی اور نئے ملک کے مقابلے میں وہاں موسیقی کی صورت حال قدرے بہتر رہی۔ نئے ملک کے قیام کے بعد وجود میں آنے والا معاشرہ لُوٹ کھسوٹ پر مشتمل تھا، بیشتر لوگ تعمیرِ ملک کے عمل میں حصہ لینے کی بجائے جعلی الاٹمنٹوں کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لیے اس دریا میں کود پڑے۔ افراتفری اور غیر محفوظیت کے اس زمانے میں عام لوگوں کی بات چھوڑیئے ایک مدت تک تو خود گانے بجانے والوں کو بھی موسیقی کا خیال نہ آیا۔ کئی سال بعد جا کر لوگوں کے مسائل جب قدرے کم ہوئے تو موسیقی کی خال خال محفلیں سجنا شروع ہوئیں، اور پہلے سے موجود بیٹھکوں کے ساتھ ساتھ موسیقی کی نئی بیٹھکیں وجود میں آنے لگیں۔

2- موسیقی کی اس عظیم روایت کے زوال کا ایک سبب یہ تھا کہ نئے معاشرے میں نئے علوم و فنون جگہ لے رہے تھے یا پھر پرانے علوم کی شکلیں تبدیل ہو رہی تھیں۔ لوگوں کے مذاق اور ذہنی مطالبات تبدیل ہو جانے کے باعث پرانے فنون و علوم کو سینے سے لگانے والے بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔ دراصل نئے ملک میں جو نیا معاشرہ ہم تعمیر کرنے جا رہے تھے وہ ترقی کے گھوڑے پر بیٹھا سرپٹ دوڑتا ہوا معاشرہ تھا جس کے پاس رُکنے اور رُک کر سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی ایسے میں کس کے پاس وقت تھا کہ وہ رُک کر موسیقی کی خبر لیتا۔

3- ریڈیو اور ٹی وی کے آنے سے اگرچہ لوگوں کی کلاسیکی موسیقی تک رسائی آسان ہوئی مگر انہی اداروں کے موسیقی ناآشنا افسران کے بیورکریٹک روّیوں نے موسیقی اور اس سے وابستہ افراد کو نقصان بھی پہنچایا۔ جس کی ایک اذیت ناک مثال استاد بڑے غلام علی خاں ہیں جنہوں نے زیڈ اے بخاری کے روّیے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے پاکستان کی سکونت ترک کر کے ہندوستان کی شہرت اختیار کر لی۔

4- چونکہ نئے ملک کے قیام میں مذہب بطور ہتھیار استعمال ہوا تھا اس لیے اب یہی ہتھیار موسیقی کے خلاف استعمال ہونے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ چنانچہ موسیقی کے حوالے سے حلال اور حرام کے مباحث شروع ہوئے، اس کا تعلق علم کی بجائے محض تفریح اور عیاشی کے ساتھ جوڑا جانے لگا۔ ادھر ایک طبقے نے ہندوستانی اور پاکستانی موسیقی کے امتیاز کا بیڑہ اُٹھا لیا اور یوں دُھروپد کو کلاسیکی موسیقی بلکہ پاکستان ہی سے نکالنے کے لیے کمریں کس لیں۔ یہ مذہبی فریضہ ادا کیا جا چکا تو اب اگلا ہدف

بچ رہنے والی خیال گائیکی تھی۔ چنانچہ اس کا سننا حرام قرار پایا اور اس فن سے وابستہ لوگوں کا سماجی مرتبہ سوالیہ نشان بنا دیا گیا۔ چنانچہ فن کار بددل بھی ہوا اور گوشہ گیر بھی۔ حکومتی سرپرستی شروع دن سے نہ ہونے کے برابر تھی، ریڈیو اور آرٹس کونسلوں کی موسیقی کانفرنسیں بھی کم ہوتے ہوتے ختم ہونے کے قریب پہنچ گئیں۔

5- شہروں کے جنگل کی طرح پھیلنے، فاصلوں کے بڑھنے اور ہلاک کر دینے والی مہنگائی نے موسیقی کی بیٹھکوں کو عام آدمی کی رسائی سے پَرے کر دیا۔ ایک زمانہ تھا جب زندگی میں ابھی فاصلوں نے جنم نہیں لیا تھا چنانچہ لوگ روزانہ کی بنیادوں پر ان بیٹھکوں کا رُخ کرتے تھے مگر فاصلے بڑھنے سے لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے چلے گئے۔

6- اظہار کے نئے نئے ذرائع مثلاً ریڈیو، ٹی وی، اخبارات و جرائد، انٹرنیٹ، فیس بک، موبائیل، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، سکائپ، ٹویٹر، ٹیپ ریکارڈر، وی۔ سی۔ آر، وی۔ سی۔ ڈی وغیرہ میسر آنے کے نتیجے میں بھی موسیقی سے پیار کرنے والوں کی توجہ تقسیم ہوتی چلی گئی۔ کیونکہ اب انہیں تسکین کے نئے اور جدید ذرائع میسر آنے لگے تھے۔ اس روّیے نے بھی بیٹھکوں کی ویرانی میں کردار ادا کیا۔

7- بیسویں صدی کے ربعی آخر تک آتے آتے بیٹھک کلچر اگرچہ موجود تو تھا مگر اب اس ادارے کی شکل اور کردار تبدیل ہونے لگا تھا۔ یہ بیٹھکیں اب اپنا نام اور تاریخی کردار تبدیل کر رہی تھیں۔ اب ان بیٹھکوں کو میوزک اکیڈمیوں کے نام سے یاد کیا جانے لگا تھا اور یہ ہر چھوٹے بڑے شہر میں کھمبیوں کی طرح اُگ آئی تھیں۔ جن بیٹھکوں میں اپنے عہد کے نامور گوئیّے شاگردوں کو مشنری بنیادوں پر سکھایا کرتے تھے اب وہاں ادنیٰ مہارت رکھنے والے کمرشل بنیادوں پر سکھانے لگے تھے مگر اصل سوال تو یہ ہے کہ جس معاشرے کو موسیقی کی ضرورت ہی نہ ہو وہاں فن کار کا المیہ ن م راشد کے ''اندھے کباڑی'' سے مختلف نہیں ہوتا۔ جو خوابوں سے کٹے ہوئے معاشرے میں خواب فروشی کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔

8- ویسے تو پاکستان و ہندوستان دونوں جگہ کلاسیکی موسیقی کی یہ بیٹھکیں اپنے منطقی انجام کو پہنچ رہی تھیں مگر پاکستان میں کلاسیکی موسیقی کا گڑھ لاہور تھا اور لاہور میں کلاسیکی موسیقی اور موسیقی کی

بیٹھکوں کا مرکز بازارِ حسن تھا۔ موسیقی سے وابستہ ہزاروں افراد کا رزق اسی بازار کی ثقافتی سرگرمیوں سے وابستہ تھا مگر جنرل ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد بازارِ حسن کو فتح کرنے کا ارادہ کیا اور اس بازار میں صدیوں سے جاری ناچ گانے پر پابندی لگا دی۔ جس کے نتیجے میں ایک طرف تو بازارِ حسن پورے لاہور میں پھیل گیا اور دوسری طرف موسیقی کے فن سے وابستہ گانے بجانے والوں کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ یوں یہ واقعہ کلاسیکی موسیقی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔ وہ ہیرا منڈی جہاں فیض، تاثیر، اختر شیرانی، بیدی، منٹو، عدم، عابد علی عابد، صوفی تبسم اور بہت سے دوسرے اہل قلم پھجّے کے پائے کھانے کے بہانے گلگشت کیا کرتے تھے، وہ بازار جس کے کسی عالیشان گھر سے اپنے عہد کی نامور رقاصائوں کے گھنگھرئوں کی چھنک قریب سے گزرنے والوں کے خون کی گردش تیز کر دیا کرتی تھی، وہ گلی جہاں سے گزرتے ہوئے بڑے غلام علی خاں کی مُدھر تانیں آنے والوں کے استقبال کے لیے آتی تھیں، وہ بازار جہاں سے رقص، فلم اور موسیقی کے جدید ترین رجحانات جنم لے کر ہر طرف پھیلتے تھے۔ اب وہ پورا علاقہ کسی عاشق کے دل کی طرح ویران ہو گیا۔ اب وہاں ساز بجتے ہیں، نہ گھنگھرو چھنکتے ہیں اور نہ سُر میں بھیگی کسی گائیک کی تان گونجتی ہے بلکہ اس پورے علاقے پر جُوتا سازی کے کاروبار نے یلغار کر رکھی ہے۔ ماضی کے خوابناک ایوان نئے جوتوں کے سٹورز میں تبدیل ہو چکے ہیں اور وہ بازار جہاں کبھی خوشبوئوں کا بسیرا تھا اب وہاں سے گزرتے ہوئے جوتوں میں استعمال ہونے والے سلوشن کی تیز بدبو نتھنوں کو چیر کر رکھ دیتی ہے۔ ماضی کے اس خوبصورت ماحول، اور رزقِ خاک بنا دیئے گئے ثقافتی مظاہر کا نعم البدل رنگ برنگے جوتے قرار پائے ہیں جو یقیناً ایک شاندار، خوبصورت اور مرحوم تہذیب کے منہ پر جوتے کے برابر ہے۔

اگرچہ ماضی کی یہ عظیم بیٹھکیں اپنا تاریخی اور فعال کردار ادا کر چکی ہیں۔ ان میں سے بے شمار بیٹھکیں تعمیرِ نو کے نام پر گرا دی گئیں مگر جو بچ رہی ہیں وہ بہت مخدوش حالت میں ہیں۔ دونوں طرف کی حکومتوں کو چاہیے کہ مٹتی ہوئی تہذیب کی ان عظیم نشانیوں کو بچانے کے لیے آگے آئیں۔ اگر سیالکوٹ اور لاہور میں علامہ اقبال کے زیرِ استعمال گھر میوزیم بنائے جا سکتے ہیں، پشاور میں موجود اداکار دلیپ کمار کا آبائی گھر ثقافتی ورثہ قرار پا سکتا ہے، اگر پرانی انارکلی میں موجود پرانی عمارتیں فوڈ سٹریٹ کے نام پر

رینوویٹ ہو سکتی ہیں تو پھر موسیقی کی وہ بیٹھکیں کیوں نہیں جو اپنے عہد کے عظیم موسیقاروں کے وجود سے آباد رہیں اور جنہوں نے موسیقی کے فروغ میں صدیوں تک بہت سے سرکاری اداروں سے زیادہ اہم کردار ادا کیا؟

حوالہ جات

1- سُر سنسار، شہباز علی، ص38، علی پبلی کیشنز، راولپنڈی، 2007ء

2- کیا صورتیں ہوں گی، شہباز علی، ص104، قاضی ظہور الحق، سکول آف اورینٹل میوزک، راولپنڈی، 2012ء

3- لاہور لاہور اے، اے حمید، ص144، الفیصل پبلشرز، لاہور، 2008ء

4- ایضاً، ص145-146

5- شاہ مُہرے، مقصود ثاقب، ص36، سچیت کتاب گھر، لاہور، 2011ء

6- لاہور لاہور اے، اے حمید، ص206-7

7- قاضی ظہور الحق معروف موسیقار تھے۔ 1909ء میں ہندوستان کے موضع ریواڑی، ضلع گوڑ گائوں (انبالہ ڈویژن) میں پیدا ہوئے۔ موسیقی کی ابتدائی تعلیم پنڈت رگوناتھ رائوجی سے حاصل کی اور 1935ء میں نیو انڈیا فلم کمپنی میں بطور میوزک ڈائریکٹر ملازم ہوئے۔ انہوں نے "پریم یاترا، جوش انتقام اور نیم شاہ ڈاکو" سمیت درجنوں فلموں کے لیے موسیقی ترتیب دی۔ قیام پاکستان کے بعد راولپنڈی چلے گئے اور "ریڈ ئنٹ کلاسیکل میوزک اکیڈمی" کی بنیاد رکھی۔

8- ہیرابائی بروڈکر بیسویں صدی کی نامور کلاسیکل مغنیہ اور کیرانہ گھرانے کے ممتاز استاد عبدالکریم خاں کی صاحبزادی تھیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے اور بعد ازاں استاد عبدالوحید خاں سے کسبِ فیض کیا۔

9- کیاصورتیں ہوں گی، شہباز علی، ص93، سچیت کتاب گھر، لاہور، 2011ء

10- استاد توکل حسین خاں (مضمون) ایم اے شیخ، روزنامہ مشرق، لاہور، 26اکتوبر1990ء

11- سُر سنگیت دے ہیرے، مقصود ثاقب، ص28-29

12- ایضاً، ص74

13- اصل نام بدرالدین تھا، استاد اللہ دِیا خاں کے درمیانے بیٹے اور اپنے عہد کے اچھے گویّے تھے۔ 1937ء میں اڑتالیس برس کی عمر میں وفات پائی۔

14- اصل نام شمس الدین تھا۔ ان کی آواز تو اچھی نہیں تھی مگر والد کی وفات کے بعد انہوں نے بہت سے لوگوں کو موسیقی کی تعلیم دی۔

15- تال ساگر، استاد بدرالزماں خاں، ص435، ادارۂ فروغِ فنِ موسیقی، لاہور، 1991ء

16- سُر سنسار، شہباز علی، ص26، علی پبلی کیشنز، راولپنڈی، 2007ء

17- سنگیت کاراں دیاں گلاں، مقصود ثاقب، ص60، سچیت کتاب گھر، لاہور، 2013ء